محمد حنیف ندوی

تاثرات

(۲)

اب سوال یہ ہے کہ اسلام کی تہذیبی اقدار میں زندگی کی روح کیونکر پھونکی جائے۔ اور احیائے اسلام کی تحریک کو کن خطوط پر چلایا جائے۔ ہماری رائے میں یہ اہم کام علم و عمل کے دو خانوں میں منقسم ہونا چاہیئے۔ عملی دائرے کی وسعتیں کہاں سے کہاں تک وسعت پذیر ہیں۔ اور اس سلسلہ میں انفرادی و اجتماعی سطح پر کن کن کوششوں کو بروئے کار لانا ضروری ہے؟ بحث کے اس پہلو سے ہم بعد میں تعرض کریں گے۔ سر دست ہم جس چیز کو غور و فکر کا مدار و محور ٹھہرانا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کو ایک زندہ، فعال اور قابلِ فہم نظامِ حیات کی صورت میں پیش کرنے کی غرض سے علمی حد تک ہمیں کیا قدم اُٹھانا چاہیئے۔ نیز اس ضمن میں اس حقیقت سے آگاہ ہونے کی بھی ضرورت ہے کہ اس کے حسن و جمال کے کن کن گوشوں کو مشتاقانِ دیدار کے سامنے لانا مناسب ہے۔

اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اس منزل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں اور واقعی اسلام کو نئے انداز، نئی سج دھج اور نئے طریق سے پیش کرنے کے آرزومند ہیں تو ہمیں پہلے ہی قدم پر اس بات کو مان لینا چاہیئے کہ موجودہ دور میں پرانے علم الکلام سے کام نہیں چلے گا۔ یاد رہے کہ یہ کہہ کر ہم اپنے اسلاف کے کارناموں کا استخفاف نہیں کرنا چاہتے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آج علم و فن کی جس قدر روشنی ہے اور تہذیب و تمدن کی جس قدر گہما گہمی، اور آب و تاب ہے، اس میں ہمارے قدماء کی گراں قدر مساعی کا کتنا حصہ ہے۔ آخر ہم علم و معرفت کے ان رواں دواں قافلوں کو کس طرح فراموش کر سکتے ہیں جنہوں نے یونانی

فلسفہ کی متاعِ عزیز کو مع مفید اضافے کے ہم تک پہنچایا اور ذہن کی تابش و ضو کو بڑھانے میں قائدانہ کردار ادا کیا۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہر دور چونکہ اپنے ساتھ علوم و معارف لاتا ہے، نئی صداقتوں کو جنم دیتا ہے۔ اور نئے نئے شبہات و شکوک اور نئی نئی گمراہیوں کی تخلیق و آفرینش کا بھی باعث ہوتا ہے۔ یہی نہیں، ہر دور کے ساتھ چونکہ فکر و تعمق کے پیمانے اور بیان و اظہار کے انداز و اسلوب بدلتے رہتے ہیں۔ اس بناء پر جو لوگ ایٹم کے اس دور میں دیانتداری سے مذہب کا احیاء چاہتے ہیں، انہیں اپنے خیالات و افکار کی تنظیم کے سلسلے میں فلسفہ و دانش کے جدید ترین اسلحہ سے لیس ہونا پڑے گا۔ اور ان تمام شکوک و شبہات کا جائزہ لینا ہوگا کہ جن سے الحاد و لادینی کے رجحانات فروغ پاتے ہیں۔ نیز یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ عقاید و اقدار کی ترتیب میں کیا نئی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر الٰہیاتِ جدیدہ کی تدوین کا مسئلہ قدیم متکلمانہ بحثوں سے قطعی الگ اور منفرد نوعیت کا حامل ہے۔ پہلے بحث کا انداز یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات و ذات کے مابین رشتہ و تعلق کی کیا کیفیت ہے؟ کیا صفات و ذات ایک ہی حقیقت سے تعبیر ہیں۔ یا دونوں میں نسبت تغائر ہے۔ تیسرا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تعلق کی نوعیت غیر متعین ہے اشاعرہ ذات و صفات میں فرق و امتیاز کے قائل تھے، معتزلہ اور حکما عینیت کا دم بھرتے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو لاعین اور لاغیر کے مؤقف پر قائم تھے۔ بحث کا دوسرا رُخ وہ تھا جس نے اثبات و نفی یا تجسیم و تجرید کی بحثیں اٹھائیں اور مسلمانوں کو اہل سنت اور عقلیت پسند دو مستقل گروہوں میں تقسیم کر دیا۔

لیکن آج اس دورِ پُرآشوب میں جس اشکال کا ہمیں سامنا ہے وہ ذات و صفات کے مابین ربط و تعلق کی تعیین نہیں۔ بلکہ یہ کہ خود اس ذات کی کیا حیثیت ہے۔ کیا خدا کے وجود کو عقل و خرد کی روشنی میں ثابت کیا جا سکتا ہے۔ کیا اس کے اقرار سے انسانی خودی اور "انسانی انا" کا خاتمہ تو نہیں ہو جاتا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے مان لینے

سے کہیں ترقی کی راہیں تو مسدود نہیں ہو جاتیں اور رجعت پسندی و تاخر کے دواعی تو نہیں اُبھرتے۔

یوں تو انکارِ خدا کا مسئلہ بہت پُرانا ہے۔ چنانچہ بدھ اور جین کے دینی و اخلاقی تصور میں خدا کے اقرار کے لئے کوئی گنجائش پائی نہیں جاتی۔ مگر اس وقت جو صورتِ حال ہے وہ اس سے قطعی مختلف ہے۔ بدھ اور جین نے انکارِ خدا کو اپنے دعویٰ کی اساس و بنیاد قرار نہیں دیا تھا بلکہ کیا صرف یہ تھا کہ انہوں نے برہمنوں کا زور توڑنے کے لئے اخلاق و تہذیب کے بستانِ سرسبز کو، اللہ تعالیٰ کو مانے بغیر ہی سجانے کی ایک کوشش کی تھی۔ یہ تجربہ کامیاب رہا یا ناکام، سردست یہ چیز موضوعِ بحث نہیں کہنا صرف یہ ہے کہ موجودہ دَور کی فکری سرکشی صرف اس پر اکتفا نہیں کرتی کہ لوگ عملی زندگی میں خدا کو نظر انداز کیے رہیں۔ بلکہ یہ چاہتی ہے کہ حریفانہ اس دعویٰ کا جائزہ لیا جائے اور خدا کے تصور کو قلب و ذہن کے ہر ہر گوشے سے نکال باہر کیا جائے۔ یہی نہیں۔ موجودہ علوم و تصورات کی کمک سے اس محاذ پر ایسا بھرپور اور متفقہ حملہ کیا جائے کہ اعتقاد و یقین کے فلک بوس قلعے زمین پر آرہیں۔

اس سلسلہ میں جن علوم و فنون اور افکار کی خصوصیت سے آڑ لی جاتی ہے وہ کئی خانوں میں منقسم ہیں۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ مادّہ اپنے ارتقاء اور پھیلاؤ کی تمام کڑیاں پہلے سے اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے اور اس کا نظامِ تعلیل اس درجہ محکم، اس درجہ باقاعدہ اور مرتب ہے کہ ارتقاء و اظہار کے کسی مرحلہ میں بھی کسی خارجی قوت و عامل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اٹھارویں صدی کی مادّیت کے اس تصور میں بنیادی نقص یہ تھا کہ اس سے حیات و شعور کی سطحیں واضح نہیں ہو پاتی تھیں۔ مگر اب یہ کہہ کر بظاہر اس شبہ کا بھی ازالہ کر دیا گیا ہے کہ مادّی ارتقاء کے معنی صرف کمیت (QUANTITY) کے ارتقاء کے نہیں

ہیں کہ مادہ صرف مادیت ہی کو جنم دے بلکہ ارتقاء کہ یہ دور در حقیقت کمیت و کیفیت کے دو متقابل نقاط میں ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ ارتقاء کے مختلف مراحل میں مادہ نئی نئی اور عجیب و غریب کیفیتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے اور انہیں نئی نئی عجیب و غریب کیفیات میں حیات و شعور کے مختلف مظاہر بھی داخل ہیں۔

نفسیات کے مختلف مدارسِ فکر کا حاصل بھی انکار ہی ہے۔ مثلاً انسانی ذہن اگر مادیت ہی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے اور اپنے اعمال و وظائف میں حیاتیاتی عناصر اور خارجی ماحول کا مرہونِ منت ہے تو روح کا روایتی تصور ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس عقیدہ کے لیے بھی کوئی منطقی اساس باقی نہیں رہتی کہ روح و معنی الوہیت کو مادہ پر تقدم حاصل ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں تو مادہ ہی کو مقدم پایا جائے گا اور ذہن و فکر کی کرشمہ سازیوں سے متعلق سمجھا جائے گا کہ مادی ارتقاء کے ایک خاص مرحلہ میں معرضِ ظہور میں آئی ہیں۔

اسی طرح اگر سلوکیوں کی اس رائے کو مان لیا جائے کہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد خاص خاص محرکات اور اس کے جواب پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ ذہن انسانی کی تازہ کاریاں بھی جبر کا شکار ہو کر رہ جائیں گی اور ایک انسان اختیار آفرین خلاق کی احتیاج سے یکسر بے نیاز ہو جائے گا یہی حال نفسیات کے دوسرے افکار کا ہے کہ اگر انسانی اعمال کا مدار و محور جنس ہے جیسا کہ فرائڈ (FREUD) کہتا ہے یا اس کے اونچے سے اونچے اور لطیف سے لطیف کردار کی تہ میں بھی طمع اور حفظِ دولت کے عوامل کارفرما ہیں، جیسا کہ دوسرے ماہرین نفسیات کا خیال ہے تو مذہب و دین کا سارا کارخانہ ہی غتر بود ہو جاتا ہے اور اخلاق و مذہب کی وہ تمام دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں کہ جن کو تنہا "خدا پرستی" کا عقیدہ ہی استوار کر سکتا ہے۔